Chapter. 2

باب دوم

کیفی اعظمی کی سوانح حیات

اعظم گڑھ، یو۔ پی۔ کے گاؤں مجواں کے مسلم شیعہ زمیندار گھرانے میں تولد ہونے والے لڑکے کا اسم گرامی اطہر حسین رضوی رکھا گیا۔ جو بعد میں کیفی اعظمی کے نام سے مشہور ہوا۔ کیفی اعظمی اپنی تاریخ ولادت کے سلسلے میں اپنے مجموعہ ء کلام 'کیفیات' میں رقمطراز ہیں: ''میں اپنے بارے میں یقین کے ساتھ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں محکوم ہندوستان میں پیدا ہوا، آزاد ہندوستان میں بوڑھا ہوا، اور سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا۔'' [1]

کیفی اعظمی کے دادا میر عطا حسین رضوی مقبول زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک و ملت سے سچی محبت کرتے تھے۔ اپنے دادا مرحوم کے وطن سے محبت اور عقلی شعور کو کیفی صاحب کیفیات میں یوں تحریر کرتے ہیں۔ ''بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیل کی کاشت شروع کروائی تو ہمارے گاؤں میں نیل کے بیج آئے اور کارندوں کی زبانی پیغام آیا کہ جو گیہوں بونا چھوڑ دو نیل کی کھیتی شروع کرو تو کمپنی بہادر تم کو مالا مال کردے گی۔'' میرے دادا مرحوم نے جب یہ سنا تو انہوں نے رازدارانہ طور پر گاؤں والوں کو

سمجھایا کہ دیکھو کمپنی ہمارے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ کر ہماری صنعت و تجارت کو ٹھکانے لگا چکی ہے۔ اب کھیتی باڑی کو بھی تباہ کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے چپکے چپکے ان بیجوں کو بونے سے پہلے بھون ڈالو۔ بھنے ہوئے بیج اگ نہیں سکتے اور جب وہ اگیں گے نہیں تو کمپنی یہ سمجھے گی کہ اس گاؤں کی زمین نیل کی کھیت کے لیے مناسب نہیں اور ہم کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ دادا مرحوم نے خود یہی کیا۔ اور ان کے مشورہ پر کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ جب نیل کے بیج اگے نہیں تو کمپنی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئی کہ اس گاؤں کی زمین اچھی نہیں ہے۔ لیکن کچھ دنوں میں یہ بات سب کو معلوم ہوگئی کہ کسانوں نے نیل کے بیج میر عطا حسین کے کہنے پر بھون ڈالے تھے۔ دادا مرحوم پر

۲

مقدمہ چلا ار جائداد ضبط ہوئی لیکن اس کے بعد کمپنی نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو نیل بونے پر مجبور نہیں کیا۔'' ۲

کیفی صاحب کے والد کا نام سید فتح حسین رضوی تھا۔ وہ خود بھی شاعر تھے، ان کی شخصیت ادب دوست کی تھی۔ آپ کی والدہ کا نام گرامی سیدہ حفیظ النساء عرفِ کنیز فاطمہ تھا۔ سید فتح حسین رضوی اور

کینز فاطمہ کی آٹھ اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹیوں میں قمر انساء، محسنہ، آمنہ اور واجدہ تمامی بہنیں یکے بعد دیگرے دق جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر انتقال فرما گئیں۔ ان کے علاج اور نتقال کے دوران کی کشمکش نے کیفی کو بہت متاثر کیا۔ ان کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے کیفی لکھتے ہیں کہ:

”اما جہاں اپنی کسی بیٹی کو لے کر علاج کے لئے جاتیں، مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا۔ اس طرح میں نے اس کچی عمر میں اپنے چاروں طرف بیماریوں اور دکھوں کا ہجوم دیکھا۔ اور میں دھیرے دھیرے غم پسند ہوتا گیا۔“ ۳

کیفی صاحب کے والد تعلیم اور شاعری سے حد درجہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اس جذبے کے پیش نظر انہوں نے اپنے چاروں بیٹوں کو بہترین تعلیم سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کیفی صاحب کے سب سے بڑے بھائی ظفر حسین صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ آپ کا تخلص مجروحؔ تھا۔ منجھلے بھائی یوسف حسین کا تخلص بیتابؔ، اور تیسرے بھائی شبیر حسین کا تخلص وفاؔ تھا۔ اس وقت اچھے شاعروں کی فہرست میں شمار ہوتے تھے۔ اس طرح آپ کے گھر کی فضا ادب اور شعر و

شاعری سے لبریز تھی۔ کیفی بچپن ہی سے صبر و استقلال کے حامی تھے۔ شکایت کرنا آپ کی فطرت میں نہیں تھا۔ آپ کے صبر و استقلال کو ظاہر کرتا ایک واقعہ ان کی ہمدرد و غم گسار اہلیہ شوکت اعظمی نے بڑے ہی مویس پیرائے میں بیان کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

''چھ سات سال کی عمر میں ایک بار یکہ پر گاؤں جاتے ہوئے اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ یکہ سے ساتھ لٹکتا ہوا ایک میل چلا گیا۔ لیکن اس کے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ جب پیچھے سے آتے ہوئے ایک شخص نے دیکھا تب وہ چلایا اور یکہ رکا، اور اس بچے کی جان بچی۔ پیٹ اور ٹانگیں چھل چکی تھیں۔'' ۴

کیفعاحب کے والد نے اپنے بڑے لڑکے کو علی گڑھ مسلم یونی ورسیٹی میں تعلیم دلوائی اور باقی کو لکھنو میں۔ کیفی صاحب کے والد کی تربیت اور انداز فکر کا ایک واقعہ کیفی صاحب بظاہر خود پیش کرتے ہیں۔

''بابو خاں بیٹھے ہوئے تھے ابا کے ساتھ۔ میں باہر سے کہیں گلی ڈنڈا کھیل کر آ رہا تھا۔ میں دیکھا اور جھٹ سے گھر میں چلا گیا۔ ان کے سلام نہیں کیا۔ ابا کا یہ طریقہ تھا کہ وہ سامنے کسیے نہیں

ڈانٹتے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو ابا نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ، بھئی وہ تمہارے بابو چچا بیٹھے تھے، تم نے سلام کیوں نہیں کیا؟ میں نے کہا میں بھول گیا۔ کہا ہاں، ہو جاتی ہے آدمی سے بھول۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ اچھا ایسا کرو کہ یہاں جتنے تاڑ ہیں، سب کو آداب کرو۔ ہم جھک جھک کر خوب آداب کر رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔ اور وہ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ خوب گھنٹوں مشق کروائی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اب تک کوئی بزرگ آجائے تو ہاتھ اٹھے بغیر نہیں رہتا۔'' ۵

کیفی صاحب کے والد اپنی چار چار بیٹیوں کے انتقال کی وجہ سے ہر اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ وہ ایسا سوچتے کہ انہوں نے اپنے تینوں صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم سے سرفراز کروایا اور یہ ان سے گناہ ہوا۔ انہوں نے مغربی طرز کو برتری دی اور اسیں گناہ کا عذاب یا عتاب ان پر نازل ہوا ہے۔ جس نے ان کی چاروں بیٹیوں کو نگل لیا۔ انگریزی اسکولوں میں فاتحہ پڑھنا نہیں سکھایا جاتا اس لیے ان کے مرنے کے بعد کوئی فاتحہ پڑھنے والا تک نہ ہوگا۔ اس روایتی سوچ کے زیر اثر اس درد کو کم کرنے کے لیے کیفی صاحب کے والد نے اپنے چھوٹے بیٹے یعنی کیفؔ اعظمی کو دینی تعلیم دلوانے کی غرض سے اس

وقت کی شمالی ہند کی سب سے بڑی درسگاہ لکھنو کے سلطان المدارس میں داخل کر دیا۔ کیفی صاحب کے والد جہاں دنیاوی تعلیم کی اہمیت سمجھتے تھے وہیں انہیں خوف الٰہی بھی تھا۔ اس وقت کے مدارس کی تعلیم اوراس میں پڑھ کر نکلنے والے بچوں کی زندگی میں ہونے والی اصلاح سے وہ واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک حصول علم صرف لکھنا پڑھا نہیں تھا بلکہ وہ یہ مانتے تھے کہ دین و دنیا کی تعلیم پسند کرنے والے راستے کی بھی کافی اہمیت ہے۔ اپنے تینوں بیٹوں کوانھوں نے دنیوی تعلیم کی جانب رواں دواں کیا تو کیفی صاحب کوصرف چودہ سال کی عمر میں سلطان المدارس میں داخل کیا۔ سلطان المدارس کی اس وقت کافی مقبولیت تھی۔ دوردراز ملک سے طلباء یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے۔ وہاں مولوی حضرات اپنے طریقے اور رعب سے بچوں کوتعلیم سے سرفراز کرتے۔ کیفی صاحب کے تجسس اورانقلابی
طبیعت کے جوہر سلطان المدارس میں عیاں ہوئے بغیر رہ نہ سکے۔ سلطان المدارس، اس کے طریقے اراس کے سلسلے میں خود کیفی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

”میں دیکھتا ہوں کہ ہر روز جب انٹرول ہوتا ہے، مولانا جو ہمیں پڑھاتے تھے ہمارے درجے کے ایک لڑکے کو جس کے خط و خال دل کش تھے، اپنے ساتھ کمرے میں چلے جاتے اور اندر سے دروازہ بند ہو جاتا، میں نیا نیا گاؤں سے آیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں تجسس زیادہ ہوتا ہے۔ میرے دل میں بھی کرید پیدا ہوئی کہ دیکھوں کمرے میں ہوتا کیا ہے۔ روشندان جو ذرا بلندی پر تھا میں نے اس کے نیچے ایک اسٹول رکھا اور اس پر کھڑے ہو کر روشندان سے کمرے میں جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا ہمارے مولوی صاحب پلنگ پر دراز ہیں۔ دو تین مولوی صاحب پلنگ پر، کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ لڑکا ہمارے مولوی صاحب کے پلنگ پر بیٹھا ایک چھوٹی سی کتاب پڑھ کر ان کو سنا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مولوی صاحب کہتے لاحول ولا قوۃ۔ اور لڑکے کے گال میں زور سے چٹکی لیتے۔ باری باری دوسرے مولوی صاحبان بھی یہی حرکت کرتے۔ اس وقت شیعہ مولوی صاحبان اور مولانا عبدالشکور میں بڑے مناظرے ہو رہے تھے۔ میں سمجھا، اسی سلسلے کی یہ کوئی کتاب ہوگی۔ ہمارے مولوی صاحب جس

کا منہ توڑ جواب لکھیں گے شاید۔

جب کمرہ کھلا اور لڑکا باہر نکلا تو میں نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے طرح طرح سے پوچھنا شروع کیا کہ تم کیا پڑھ کے سناتے ہو۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا اور مجھے وہیں ٹھرنے کا اشارہ کر کے بھاگ کر کمرے میں گیا اور کتاب لا کر مجھے دکھائی۔ یہ مختصر سے افسانوں کا مختصر سا مجموعہ انگارے تھا۔ جس پر یوپی سرکار نے پابندی لگا رکھی تھی۔ ترقی پسند ادب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا''۔ ٦

سلطان المدارس مولوی صاحبان کی ایک ایسی سلطنت تھی کہ وہاں کے عمل ردِعمل سے لے کر ہواؤں پر بھی انہیں کا قابو تھا۔ مدارس میں قاعدے قوانین پر سختی سے عمل کروایا جاتا۔ طلباء یا کسی فرد کی مجال نہ تھی جو ان قوانین میں دخل اندازی کرتا۔ مدارس کے ماحول میں ظلم اور من مانی کی بو آتی تھی۔ وہاں کے طریقہء تعلیم مولوی حضرات کے مزاج اور طریقہء شوق کا غلام تھے۔ طلباء اس ماحول میں خوف اور بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ مولوی حضرات کے ان احمقانہ رویے کو روکنے اور ان کو سبق سکھانے کی جرائت کسی میں نہیں تھی۔ سالوں سے

چل رہے اس مدارس میں تعلیم کے نام پر طلباء کا استحصال ہو رہا تھا۔ سالوں سے خاموشی سے ظلم کو سہہ رہے طلباء کو یہ کہاں معلوم تھا کہ ان کے مدرسہ میں داخل ہونے والا سات ہسال کا بچہ جس کا نام اطہر حسین (کیفی اعظمی) ہے وہ ان کے تمام مسائل کا حل لائے گا۔ سلطان المدارس وہاں کے مولوی، وہاں کے قاعدے قوانین، طلباء کی حالت اور کیفی کے ردعمل کو خود کیفی صاحب اپنی کتاب کیفیات میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ''سلطان المدارس جس دن قائم ہوا تھا اسی دن اس کے سارے قاعدے قانون بن گئے تھے۔ اس میں حالات کے مطابق پھر کسی ترمیم و تنسیخ کو حرام کو سمجھا گیا تھا۔ میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر طالب علموں کی ایک انجمن بنائی اور انجمن کی طرف کی طرف سے کچھ مطالبے مرتب کر کے سلطان المدارس کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کئے۔ اس کا جواب ہم کو یہ ملا کہ یہ انجمن ہماری مخالفت میں بنائی گئی ہے۔ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے انجمن کو فوراً توڑ دو ہونہ۔۔۔۔۔۔ انجمن بن چکی تھی۔ اس کو توڑنے کا کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ ہم نے کرسیوں پر

بیٹھے لوگوں کو نوٹس دیا کہ اگر فوراً ہماری انجمن کو تسلیم نہ کیا گیا تو ہم اسٹرائک کر دیں گے۔ اور ہوا یہی کہ ہم کو کچھ دنوں کے بعد اسٹرائک کرنا پڑی۔ اسٹرائک میں تمام طالب علم شریک ہوئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد دفتر کا عملہ اور کچھ استاد بھی ہمارے ساتھ آ گئے۔ اسٹرائک کی اس وسعت سے ارباب اقتدار بوکھلا گئے۔ انہوں نے نوٹس دیا کہ سلطان المدارس بند کیا جاتا ہے اور بورڈنگ بھی بند کیا جاتا ہے۔ تم لوگ کمرے چھوڑ دو اور اپنے اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ جب سلطان المدارس کھلے گا تم لوگ بلا لیے جاؤ گے۔ ہم لوگوں نے اس نوٹس کا نوٹس نہیں لیا۔ کمروں میں ہی ڈٹے رہے اور اپنے مطالبات پر بھی ڈٹے رہے۔ ایک رات حسین آباد کے کارندے موٹے موٹے ڈنڈے لے کر آئے۔ انہوں نے ہمارا سامان کمروں سے نکال کر باہر پھینک دیا اور ہماری اچھی خاصی پٹائی بھی کی۔ ہم بھی اہنسا وادی نہیں تھے۔ ہم نے بھی اینٹ جواب پتھر سے دیا۔ اور بورڈنگ پر قبضہ کئے بیٹھے رہے۔ اس وقت تک میری شاعری شروع ہو چکی تھی۔ شاعری سی ابتدا ایک روایتی غزل سے ہوئی تھی لیکن اس اسٹرائک کے دوراں غزل گوئی چھوٹ گئی اور میں احتجاجی شاعری کرنے لگا۔ قریب

قریب روز ایک نظم کہہ لیتا اور لڑکوں کو سناتا اور ان میں جوش پیدا کرتا۔ پٹائی کے بعد دوسرے دن سلطان المدارس کے شمالی پھاٹک پر مٹنگ ہو رہی تھی۔ لڑکے کچھ زمین پر بیٹھے تھے، کچھ کھڑے تھے۔ میں ان کے درمیان کھڑا ایک نظم سنا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک زبردست نہایت وجیہ بزرگ تانگے پر بیٹھے ہماری طرف آ رہے تھے۔ میں گھبرایا کہ یہ حضرات آ کر ابھی ہم کو سمجھانا شروع کریں گے کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو۔ اس سے ہمارا اتنا بڑا تعلیمی ادارہ بدنام ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ گھبراہٹ میں میں وہ نظم اور جوش سے پڑھنے لگا۔ قریب آ کے وہ بزرگ تانگے سے اتر پڑے اور میٹنگ میں شامل ہو گئے۔ نظم ختم ہوئی تو انہوں نے مجھ سے وہ نظم مانگی۔ میں نے دے دی۔ ہایک سرسری نظم ڈال کر انہوں نے نظم جیب میں رکھ لی۔ اور مجھ سے کہا تم اور تم جس کو چاہو اپنے ساتھ لے لو اور میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں نے گنواروں کی طرح پوچھ لیا کہ آپ ہیں کون بزرگ؟ انہوں نے فرمایا مجھے علی عباس حسینی کہتے ہیں۔ علی عباس حسینی اردو والوں میں پریم چند کے بعد دوسرا بڑا نام تھا۔ میں سر جھکا کے ان کے پیچھے ہو لیا۔ وہ گولہ گنج میں رہتے تھے۔ گھر پہنچ کر حسینی صاحب نے نوکر کو چائے

بنانے کا حکم دیا اور اپنے شہزادے سے کہا جاؤ دیکھو احتشام صاحب یونیورسیٹی سے آ گئے ہوں گے۔ احتشام صاحب مجھے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دفتر لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے سردار جعفری صاحب سے ملایا۔ یہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری تھے۔ صدر اعظم صاحب نے ہماری تائد میں زبردست اداریہ لکھا۔ جعفری صاحب ہمارے مٹنگوں میں آنے لگے۔ اب ہماری ایجی ٹیشن میں توانائی پیدا ہوگئی۔ حسین آباد وقف کے متولیوں نے ہماری مانگیں مان لیں اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہماری اسٹرائک ختم ہوئی۔ لیکن میں اور میرے چند ساتھی سلطان المدارس میں سے نکال دئے گئے۔ خود کیفی اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے عائشہ صدیقی (افسانہ نگار) کے اس جملہ کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ ’صاحب، وہ ماں باپ نے اس لیے سلطان المدارس میں داخل کر دیا تھا کہ وہاں سے یہ نکل کر مولوی بن کر ان لوگوں پر فاتحہ پڑھیں گے۔ لیکن وہاں مذہب کا فاتحہ پڑھ کر نکل آئے۔‘‘ ۷

تعلیم انسان کی اہم ضرورت ہے۔ کیفی صاحب شعبۂ

ادب میں قدم رکھ چکے تھے۔ نیز سلطان المدارس سے باہر ہو چکے تھے۔ اب دینوی تعلیم کا موقع ان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عصری تعلیم کا دامن تھام لیا۔ اور پرائویٹ امتحانات کامیاب کرتے ہوئے اردو، عربی اور فارسی کی اسناد حاصل کی۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱) دبیر ماہر (فارسی)

۲) دبیر کامل (فارسی) (لکھنو یونی ورسیٹی)

۳) عالم (عربی)

۴) اعلی قابل (اردو میں)

۵) منشی (فارسی) (الہ آباد یونی ورسیٹی)

۶) منشی کامل (فارسی)

کیفی صاحب ایک سادہ طبیعت شخصیت تھے۔ آپ کا لباس، بات چیت کا طریقہ اور حلیہ آپ کی سادگی کی ضمانت تھا۔ آپ کا رنگ گندمی تھا نیز بال لمبے اور گھنگھرالے تھے۔ آپ کے مزاج میں خلوص تھا۔ اور آنکھوں میں بلا کی کشش۔

انٹرنیٹ پر موجود ایک پروگرام میں آپ کو موسیقی

کے ساتھ گاتے دیکھتے ہوئے آپ کی سادگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لباس میں ڈھیلا ڈھالا کرتہ اور بڑی مہری کا پائجامہ ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ آپ سپاہیانہ وضع کا کھدر کا کرتہ پہنتے تھے جو ان کے تیور میں موجود سپاہیانہ عنصر کو عیاں کرتا تھا۔ باتوں کے دوران انہیں مسکراتے کم، ہنستے ہوئے زیادہ پایا جاتا تھا۔ آپ کے مزاج میں خود اعتمادی، سادگی، سنجیدگی، خوردنوازی اور خوش خلقی کے بہترین جوہر دیکھے جا سکتے تھے۔ کیفی صاحب میں قوت برداشت درجہ کمال تک تھی۔ ان کے بائیں پیر کی ہڈی ۱۹۷۸ء میں ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہوگئی۔ اس حد درجہ تکلیف کے دوران بھی وہ ہنستے ہوئے لوگوں کو شعر سنا رہے تھے۔ ساڑھے چار مہینے کیفی صاحب کا پیر بندھا رہا لیکن اس پر بھی انہوں نے شکایت نہیں کی اور ہر وقت خدا کا شکر بجا لایا۔ انہیں غریبوں کا خاص خیال تھا۔ وہ اپنے گزرے حالات کو کبھی بھول نہ پائے۔ اپنے ساتھ بھلائی کرنے والے شخص کو انہوں نے تاحیات یاد رکھا۔ یہاں تک کہ نقصان پہنچانے والے فرد کو بھی مسکرا کر معاف کیا۔ رواداری اور مروت کا ایک واقعہ ان کی شریک حیات شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

''ایک دن ہمارے گھر میں چوری ہوئی۔ تمام بیڈ کور، چادریں، کمبل چوری ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ چور کون ہے۔ ایک چور مالی ہمارے گھر میں کسی کے توسط سے آ گیا تھا۔ جب ہمارے گھر میں مستقل چوریاں ہونے لگیں اور مجھے پتہ چلا کہ یہ سارا کام اسی مالی کا ہے تو میں نے اسے نکال باہر کیا، اور ایک دن جب ہم لوگ گھر سے باہر گئے ہوئے تھے، اور گھر کھلا ہوا تھا تو موقع دیکھ کر وہ مالی پھر آیا اور گھر کے تمام کمبل اور بیڈ کور اٹھا لے گیا۔ جب میں نے کیفی سے کہا کہ تم خدا کے لیے پولیس میں خبر کرو کہ ہمارے یہاں اس طرح چوری ہوئی ہے اور چور صرف وہی مالی ہے تو کہتے ہیں: دیکھو شوکت، بارش ہونے والی ہے، اس غریب کو بھی چادریں اور کمبل کی ضرورت ہوگی، اس کے بچے کہاں سوئیں گے۔ تم تو اور خرید سکتی ہو، لیکن وہ نہیں۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب کیا جواب دیتی۔''[۸]

ساحرؔ اور کیفی صاحب میں ایک مرتبہ کسی رومانی اور ذاتی قسم کی بات پر اختلاف ہو گیا۔ اس اختلاف کے پیش نظر انجمن کے ایک جلسہ میں شاعر نے کیفی کی شاعری کے نقائص ہی نقائص پر مبنی

ایک مضمون پڑھا۔ کیفی کو اس نظم میں ایک گھٹیا درجہ کا شاعر بتایا گیا تھا۔ کیفی صاحب اس جلسہ میں ابتدا سے آخر تک موجود رہے۔ مگر اپنی طرفداری میں ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔

خدا نے ہر فرد کو بے شمار کمالات اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ کیفی کو بھی قدرت نے شاعرانہ ذوق بخشا تھا۔ آپ کے گھر کے ماحول نے اس میں رونق بھر دی۔ کیفی کے والد سے لیکر تمام بھائی بہترین شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ آپ کے بڑے بھائی سید ظفر حسین جن کا تخلص مجروؔح تھا، منجھلے بھائی یوسف حسین تخلص بیتاؔب اور چھوٹے بھائی شبیر حسین سے حد درجہ متاثر تھے۔ کیفی صاحب کے گھر میں بے شمار دواوین موجود تھے۔ جس سے اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ آپ نے بھی استفادہ اٹھایا۔ آپ کا پسندیدہ دیوان ”دیوان میر انیس“ تھا۔ آپ کی شاعری میں انیس کی شاعری کا اثر ضرور مل جاتا ہے۔ انیس کی شاعری کا رعب ان کے تحت اشعور میں قائم ہے۔ انیس کے کلام سے اپنے لگاؤ کا ذکر کیفی صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں:

”جب میں چھوٹا تھا تو میری بہن جو سب سے بڑی تھی، روزآنہ مجھے میر انیس کے مرثیے سناتی اور پھر میری عادت بن گئی کہ جب تک

میں انیس کے دیوان سے دو چار بند اپنی بہن سے سن نہ لیتا تب تک رات بھر مجھے نیند نہ آتی۔ میر انیس کا کلام سنتے سنتے مجھے ان کے دیوان کا کافی حصہ ازبر ہو گیا تھا اور چونکہ حافظہ قوی تھا اس لیے ازبر کرنے میں کسی طرح کی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اور مجھے انیس اور کچھ دوسرے شعراء کے اشعار اتنی کثیر تعداد میں ازبر ہو گئے کہ ہمارے یہاں جو آئے دن بیت بازی ہوتی اس میں ان اشعار کی مدد سے جیت لیا کرتا تھا''۔ ۹

کیفی صاحب کا گھر ادب کی محفلوں کا ایک مرکز تھا۔ آپ کا بھائیوں کا شاعرانہ جوش اور والد سید فتح حسین رضوی کے ادب دوستی نے کیفی صاحب کی شاعری کا ایک خوشگوار ماحول عطا کیا۔ آپ کے گھر میں وقتاً فوقتاً شاعری اور قصیدہ خوانی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ آپ ے والد اور بھائیوں کی بدولت دور دراز سے شاعر حضرات اپنے کلام کے ساتھ تشریف لاتے۔ اس وقت کیفی کی عمر وہ تو نہ تھی کہ آپ ان محفلوں میں شریک ہونے کے لیے اپنا نام درج کرواتے، لیکن ذہن ان محفلوں سے پختگی سے تیار ہو رہا تھا۔ وہ تمام

شاعروں کی تخلیقات کوانہماک اورغور سے سنتے۔ ان کے شوق وذوق کو یہ محفلیں پروان چڑھا رہی تھی۔ ان محفلوں سے کیفی صاحب نے کافی استفادہ اٹھایا۔ یہ بات تب ثابت ہوئی جب انہوں نے چند اشعار بذات خود تشکیل دیئے اور اپنے بھائی کہ جن سے آپ کافی اتفاق رکھتے تھے، شبیر حسین وفاؔ کو دکھایا۔ وفاؔ آپ کی اس تخلیق سے بیحد متاثر ہوئے اور انہیں اس روز منعقد ہونے والی محفل قصیدہ خوانی میں پڑھنے کے لیے کہا۔ کیفی صاحب کافی شرم محسوس کر رہے تھے۔ کیوں کہ اس محفلوں میں کافی مقبول شعراء اپنے کلام پیش کرتے تھے۔ لیکن کیفی کی ہمت کا اندازہ تب ہوا جب شام کی قصیدہ خوانی میں اپنے کلام پیش کرنے والے حضرات میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ کیفی صاحب نے محفل میں اپنا کلام خوداعتمادی اور جوش کے ساتھ پیش کیا۔ خوب واہ واہ بھی ملی، لیکن لوگ اس تخلیق کو کیفی صاحب کی نہیں بلکہ کسی اور کی سمجھ رہے تھے۔ کیفی صاحب نے لوگوں کو بہت یقین دلایا لیکن لوگوں نے ان کی عمر کے مدنظر ان کے کلام کی طاقت کو محسوس ہی نہیں کیا۔ کیفی صاحب اس واقعہ سے بہت غمگین ہوئے۔ کیفی صاحب کو ایک بار پھر امتحان سے گزرنا پڑا۔ بہرائچ میں جہاں ان کے والد تحصیلداری کے

عہدے پر مامور تھے، ایک مرتبہ کیفی کے ساتھ یوں ہوا کہ کیفی واقعی اپنے کو شاعر کہتے ہیں اور لوگوں سے شاعر کہلوانا بھی چاہتے ہیں تو ان کا امتحان لے لیا جائے۔ کیفی صاحب تو ایک موقع کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے خوشی خوشی قبول کر لیا۔ شوقؔ بہرائچی کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ کسی شاعر کا کوئی مصرع پسند کر کے کیفی صاحب کو دیں۔ شوقؔ بہرائچی نے آرزوؔ لکھنوی کی غزل کا ایک شعر انہیں دے دیا۔ جو یوں ہے۔

اپنی خوشی کے ساتھ مرا غم نباہ دو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے

یہ شعر کسی ایسے شاعر کہ جس نے نیا نیا شعری دامن تھاما ہو، کافی مشکل اور سنگلاخ تھا، لیکن کیفی صاحب نے بڑی مدت دکھائی اور معینہ وقت کے اندر ہی مکمل غزل کہہ لی۔ اپنی کم عمری کے باوجود کیفی صاحب نے کیسے اچھے اشعار نکالے ہیں کہ جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ غزل کے اشعار پیش خدمت ہیں:

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے

ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے اشک غم
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو پہر حال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کے نام پہ جس کے ابل پڑے
مدت کے بعد اس نے کی جو لطف کی نگاہ
دل خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

غزل کہنے کے بعد کیفی صاحب کو اپنے ممتحن شوق بہرائچی اور اپنے والد محترم کی کافی واہ واہ اور شاباشی دستیاب ہوئی۔ اس غزل کو پیش کر کے کیفی صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ صلاحیت کے جوہر جب پھوٹتے ہیں تو عمر کی کوئی بندش اسے روک نہیں پاتی۔ کیفی کی اسی غزل کو وقت کے مشہور مغنیہ بیگم اختر منفرد آواز میں گا کر زندہ و جاوید کر دیا۔

شاعری متعلق ایک واقعہ خود کیفی صاحب اپنی تخلیق کیفیات میں یوں قلم طراز ہیں:

”ابا بہرائچ میں تھے۔ قزلباش اسٹیٹ کے مختار عام یا پتا نہیں کیا وہاں ایک مشاعرہ تھا۔ بھائی صاحبان لکھنو سے آئے تھے۔ بہرائچ، گونڈہ، نانپارہ اور قریب و دور کے بہت سے شعراء موجود تھے۔ مشاعرے کے صدر مانی جائسی صاحب تھے۔ ان کے شعر سننے کا ایک خاص طریقہ تھا کہ وہ شعر سننے کے لیے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور اپنا سر اپنے دونوں گھٹنوں میں دبا لیتیا ور جھوم جھوم کر شعر سنتے اور داد دیتے۔ اس وقت شعراء حسب مراتب بٹھائے جاتے۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر قیمتی قالینچھا ہوتا اور گاؤ تکیہ لگا ہوا ہوتا۔ صدر اسی چوکی پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھتا۔ جس شاعر کی باری آتی وہ اسی چوکی پر آکے ایک طرف نہایت ادب سے دو زانوں بیٹھ کر اپنی غزل جو طرح میں تھی سنانے لگا۔ طرح تھا مہربان ہوتا، راز داں ہوتا وغیرہ۔ میں نے ایک شعر پڑھا:

وہ سب کی سن رہے ہیں داد شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

مآنی صاحب کو نہ جانے شعر اتنا کیوں پسند آیا کہ انہوں نے خوش ہو کر پیٹھ ٹھونکنے لگے۔ پیٹھ ٹھونکنے کے لیے پیٹھ پر ایک ہاتھ مارا تو میں چوکی سے زمیں پر آ رہا۔ مآنی صاحب کا منہ گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے دیکھا نہیں کہ کیا ہوا۔ جھوم جھوم کر داد دیتے رہے اور شعر مکرر سہ کرر مجھ سے پڑھواتے رہے اور میں زمیں پر پڑا پڑا شعر دہراتا رہتا۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہوا۔ اس مشاعرے میں جتنی داد ملی اس کی یاد سے اب تک مجھے کوفت ہوتی ہے۔ بزرگوں نے اس طرح میرا دل بڑھایا کہ واہ میاں، ماشااللہ، آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ کسی نے کہا، زندہ رہو میاں، کس اعتماد سے غزل سنائی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھ رہا تھا اور کسی نہ کسی طرح ظاہر کر رہا تھا کہ مجھے میرے کسی بھائی نے غزل لکھ کر دی ہے جو میں نے اپنے نام سے پڑھی ہے۔ خیر، ان بزرگوں کی خوش فہمی کی میں نے زیادہ پرواہ نہیں کی۔ لیکن جب ابا نے بھی کوئی اس طرح کی بات کی تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں رونے لگا۔ میرے بڑے بھائی

شبیر حسین وفاؔ ابا بیٹوں میں جنہیں سب سے زیادہ چاہتے تھے انہوں نے ابا سے کہا، انہوں نے جو غزل پڑھی ہے وہ انہیں کی ہے۔ شک دور کرنے کے لئے کیوں نہ ان کا امتحان لے لیا جائے۔ اس وقت ابا کے منشی حضرت شوقؔ بہرائچی تھے۔ جو مزاحیہ شاعر تھے۔ انہوں نے اس تجویز کی تائد کی۔ مجھ سے پوچھا گیا، امتحان دینے کے لیے تیار ہو، میں خوشی سے اس کے لیے تیار ہو گیا۔'' ۱۰

کیفی کی پہلی غزل کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ اتنی کم عمری میں اتنے بلند خیال کی اس غزل نے لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ کیفی مشاعروں میں جو کچھ کہتے ہیں وہ مانگے کا اجالا نہیں، وہ خود انہیں کا ہے۔ کیفی کو اب صرف ایک استاد کی ضرورت تھی۔ جو ان کے اس فن کو تراشے۔ کیفی لکھنو میں استاد کی تلاش میں غور فرما تھے۔ اس وقت لکھنو میں دو استادوں کی مقبولیت کافی تھی۔ حضرت آرزوؔ لکھنوی اور مولانا صفیؔ۔ کیفی نے اپنے استاد کی پسند صفی صاحب پر روک دی اور ایک دن ہمت کر کے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ صفی صاحب مولوی گنج میں رہتے تھے۔ کیفی کی فرمائش اور اطلاع پر انہوں نے انہیں یاد فرمایا۔ کیفی صفی صاحب کے رو برو گئے۔ انہوں

نے کیفی سے ان کی عمر دریادت کی۔ اشعار پڑھوائے۔ داد دیا۔ اور کیفی کی غزل کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنی عمر کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک بہترین مشورہ دیا کہ ان کی شاعری کی عمر پانسٹھ برس کی ہے۔ وہ ان کی شاعری میں کوئی خامی ہو تو اصلاح ضرور کر دیں گے، لیکن پانسٹھ برس کے سینے میں گیارہ برس کے سینے جتنی جدت نہیں دستیاب ہوگی۔ استاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوئی اس شاعر کو کہ جو واہ واہ سے گمراہ ہوئے بغیر لکھتا رہے۔ اسی سبق کو ساتھ لے کر کیفی صاحب نے اپنا ادبی سفر کیا جس نے بعد میں بلندیوں کو سر کیا۔

کیفی کی غزل ان کے انداز بیاں اور ان کا رسوخ ہر محفل میں جان ڈال دیتا۔ زمانہ کالج میں کیفی کی تصویریں خوب فروخت ہوتیں۔ لڑکیوں کے محبوب شاعر تھے جو کیفی۔

۱۹۴۷ء میں کیفی جس مشاعرے میں شریک ہونے حیدر آباد پہنچے، انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ مشاعرہ ان کی زندگی بدل دے گا۔ اس مشاعرے میں کیفی کی طرح سردار جعفری، محترمہ سلطانہ اور مجروح سلطانپوری بھی۔ اختر حسین جو حیدر آباد کے روزنامہ

''پیام'' کے ایڈیٹر تھے ان کے یہاں شریک ہوئے۔

اس مشاعرے کی مقبولیت اور کیفی سے لوگوں کی محبت نے ہال کو لوگوں کے ہجوم سے بھر دیا۔ کیفی کے اسٹیج کے سامنے جو دبلی پتلی اپنے بڑے بھائی خورشید علی خان اور بہنوئی اختر حسین کے ساتھ بیٹھی تھی وہ لڑکی شوکت کیفی تھیں۔

کیفی اس مشاعرے میں ایک نظم سنا رہے تھے جس کا عنوان ''تاج'' تھا۔ یہ نظم نظام سرکار کے خلاف تھی۔ کسی میں اتنی جرئت نہیں تھی کہ اعلیٰ حضرت کے علاوہ کسی اور خطاب سے مخاطب کر سکے اور نوجوان کیفی اس نظم کو گرج گرج کر سنا رہے تھے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

ہاں یہی تاج اسی تاج زرافشاں کی قسم
حلقۂ جبر ہے محکومئی انساں کی قسم
شر کا عنوان ہے ہیہ جنگ کی تمہید ہے یہ
چھو کے جب اس کو ہوا جھومتی بل کھاتی ہے
خود بخود آگ ہر اک سمت بھڑک جھاتی ہے
مرگ میخانہ ہے گور رونق میخانہ ہے

زہر؛ ہی زہر ہے جس میں یہ وہ میخانہ ہے
اس کا سایہ جو کوئی شکل بنا دیتا ہے
اٹھ کے چنگیز خدائی کو ہلا دیتا ہے
سست ہے بغض بقا زرد ہے روئے توحید
کہ اس آغوش میں خوابیدہ ہیں فرعون و یزید
اف! یہ تاریک چمن اف یہ بھانک تنویر
عکس ڈالے ہوئے ہے زار کا منحوس ضمیر
نسل مذہب کا یہ رہتا نہیں پابند کبھی
فرق پر جس کے چمک جائے ہلاکو ہے وہی
جھوٹ اس کی تن آہن پہ جو پڑ جاتی ہے
آگ اگلتی ہوئی شمشیر ابھر آتی ہے
اس کی رونق نے اجاڑے ہیں گلستاں لاکھوں
اس نے بستی میں بسائے ہیں بیاباں لاکھوں
کانیں چھانی ہیں پہاڑوں کے ورق موڑے ہیں
ایک ہیرے کے لیے لاکھ جگر توڑے ہیں
گھر تو گھر شمع مزاروں کی بھی بجھ جاتی ہے

جب کہیں ان کے نگینوں میں چمک آتی ہے

سیم و زر اس کے لیے لاکھ اگلتی ہے زمیں
یہ وہ کشکول گدائی ہے جو بھرتا ہی نہیں
صدق کو کذب سکھاتی ہے حکومت اس کی
علم کو جہل بناتی ہے سیاست اس کی
یہ وہ جادو ہے جو ایمان پہ بھی چلتا ہے
حسب منشا اسی سانچے میں خدا ڈھلتا ہے
خون حق آ کے اسی جام میں بنتا ہے شراب
جانکنی رقص کا پا جاتی ہے رنگین خطاب
اس کا طرہ جو کبھی غیض میں لہراتا ہے
زہر سقراط کے پیالے میں چھلک جاتا ہے
زندگی اٹھتی ہے زور اس کا مٹانے کے لیے
اور بڑھتا ہے کوئی ضرب لگانے کے لیے

(تاج)

اس نظم نے شوکت کے بھائی خورشید علی خان کو حیرت انگیز کر دیا۔ انہوں نے کیفی کی تعریف میں کہا کہ "اتنی سی عمر میں یہ ہمت"۔

کیفی سے شوکت کیفی کی پہلی ملاقات کا واقعہ خود شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

"مشاعرہ ختم ہوا۔ کیفی کو لڑکیوں نے گھیر لیا۔ آٹو گراف کے لیئے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کیفی کی اس وقت کی پوزیشن کسی ہیرو سے کم نہیں تھی۔ اور جب یہ دبلی پتلی لڑکی اپنی آٹو گراف بک لیکر اسکے پاس پہنچی تو کیفی نے شرارت ایک بہت ہی مہملشعر اس پر لکھ دیا۔ اس لڑکی کی خود داری کو بہت ٹھیس پہنچی۔ اور جب گھر پہنچی تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے شکایت کی "آپ نے ہماری آٹو گراف بک پر اتنا برا شعر کیوں لکھا؟"

کیفی مشکرائے اور اسی لہجے میں بولے آپ نے سب سے پہلے ہم سے آٹو گراف کیوں نہیں لیا۔ (کیوں کہ شوکت نے سردار جعفری اور مجروح سے پہلے آٹو گراف لیا تھا)۔ دونوں کھلکھلا

کر ہنس پڑے۔ نظریں ٹکرائیں اور کیفی کی اس نظم کی کیفیت وجود میں آئی۔

دور نگاہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ
ٹھیس لگتے ہی اڑا عشق اڑا عشق شرارہ بنکر
اڑ کے پہلے انہیں جھکتی ہوئی نظروں میں رکا
نرم معصوم حسین مست اشارہ بن کر
پھر نگہ سے عرق آلود جبیں پر جھلکا
پنکھڑی پھول گہر لعل ستارہ بن کر
ڈھل کے ماتھے سے اتر آیا گل عارض میں
رنگ رس شہد نہیں، ان سے بھی پیارا بنکر
گل عارض سے سمٹ آیا لب رنگیں میں
راگ ہے لہر نہیں برق کا دھارا بن کر
لب گل رنگ سے پھر رینگ گیا بانہوں میں
بس کے بانہوں کی گدازی میں چلا دل کیطرف
چاہ الطاف کرم پیار مدارا بن کر

دل میں ڈوبا تھا کہ بس پھوٹ پڑا رگ رگ سے
جان دل جان جگر جان نظارہ بن کر
رہزن ہوش مگر ہوش کا پیغم لیے
دشمن ضبط مگر ضبط کا یارہ بن کر
درد ہی درد مگر وجہ سکوں، وجہ طرب
سوز ہی سوز مگر جان سے پیارہ بن کر
آتے ہی چھا گیا کھوئی ہوئی ہستی پہ مری
مری کھوئی ہوئی ہستی کا سہارہ بن کر
اب شرارہ وہی اس کے لب ورخسار میں ہے
اور کیفی مرے ہنستے ہوئے اشعار میں ہے

کیفی اب شوکت نامی خاتون کی محبت میں گرفتار ہو تھے۔ محبت کے اس قدم نے گھر میں ایک وسیع تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ گھر میں مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔ جھگڑے رونا پیٹنا اور اپنے اپنے خیالات کا مظاہرہ ہونا شروع ہو گیا۔ پینتالیس روپے تنخواہ کے دور سے کیفی گزر رہے تھے۔ ماں کو فکر ستانے لگی کہ اتنی کمزور تنخواہ میں بیوی کا گزر کیسے ہوگا۔ بڑی بہن کو کیفی کے وقتاً فوقتاً جیل جانے کا حیلہ

مل گیا کہ جس کا ایک پیر باہر اور ایک پیر جیل میں رہتا ہے وہ بیوی کو کہاں رکھے تھا۔

شوکت کیفی اور کیفی اعظمی کی محبت کی جیت اس وقت ہوئی جب ان کے والد نے یہ کہہ کر ان دونوں کو ممبئی بلوایا کہ "زندگی اس کو گزارنی ہے"، کیفی کو ایسے وقت میں حوصلہ دینے میں شوکت کیفی کے والد کا اہم رول رہا۔ اس وقت سجاد ظہیر اور رضیہ بمبئی میں مقیم پزیر تھے۔ انہوں نے اپنے گھر پر اس مستقبل کے نیے جوڑے کو مدعو کیا اور تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں اس محبت کو نکاح کے دھاگے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باندھ دیا گیا۔

دوران نکاح عجیب مشکل پیش آئی۔ شوکت مذہت سے سنی تھیں اور کیفی شیعہ۔ اب دو قاضیوں کا بلانا ممکن نہ تھا۔ جب قاضی نے لڑکے یعنی کیفی کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا تو "حنفی مذہب" کے الفاظ قاضی صاحب کے سماعت سے ٹکرائے اور نکاح ہو گیا۔

شوکت اب شوکت کیفی اعظمی بن چکی تھیں۔ چاروں جانب سے مبارکباد کے نعرے بلند ہوئے۔ اور شاعری کی

محفل کی کامیاب بنانے والا ایک معیاری مشاعرہ شروع ہو گیا۔ جس میں سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، سکندر علی وجد وغیرہ نے اپنے اپنے کلام بہترین نظموں اور غزلوں سے کیفی کی شادی کو یادگار بنا دیا۔

یہ وہ وقت تھا جب کیفی کی نظموں کا نیا مجموعہ ''آخر شب'' زیر طباعت تھا۔ کیفی کی شادی کی معقول تحفہ کے طور پر سردار جعفری نے ایک کاپی بہترین اور خوبصورت میں طباعت کروا کر شوکت کیفی کو بطور تحفہ پیش کیا۔ اس کاپی کے اندر سردار جعفری نے شوکت کیفی کو ان کے گھریلو نام سے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا ''موتی کے لیے''۔

زندگی جہد میں ہے جبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کو لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اوڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ
ہی چلنا ہے تجھے

اور دوسرے صفحہ پر لکھا تھا:

''ش'' کے نام۔

میں تنہا اپنے فن کو'' آخر شب'' تک لا چکا ہوں، تم آ جاؤ تو سحر ہو جائے۔ کیفی چنانچہ سحر ہو گئی اور ''ش'' شوکت بن کر ان کی زندگی میں آ گئیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکی ہوں کہ کیفی کے حالات اس وقت اتنے خوش گوار نہ تھے۔ شادی کے بعد کیفی صاحب اور بیگم شوکت کیفی اندھیری کمیون کے کمرے میں زندگی گزارنے لگے۔ کمیون میں شامل لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ نہایت نیک اخلاق، انسان دوست اور روشن خیال و روشن دماغ تھے۔ یہ کمیون میں رہنے والے لوگوں کا نسب العین سماج کے کچلے اور پریشان لوگوں کے لئے ایک نئی دنیا بنانا تھا۔ جس میں وہ دن رات لگے رہتے۔ یہ تمام لوگ ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ تمام فرد کو'' کامریڈ'' کہہ کر بلایا جاتا۔ جس کے معنی تھے ''مکمل انسان''۔ ان کامریڈیوں کا دن المیونیم یا تام چینی کے پیالے میں چائے اور ایک ہاتھ میں اخبار لیکر شروع ہوتا تھا۔ تمام نہا دھو کر صبح

دس بجے ہی دوپہر کا کھانہ کھا لیتے۔ جن میں دال، روٹی، چاول اور ایک سبزی شامل ہوتی۔ کھا پی کر اور اپنے اپنے کھانے کے برتن دھو کر تمام پارٹی کے کاموں میں مصروف کار ہو جائے۔ جب کیفی اور شوکت کیفی کمیون میں شامل ہوئے تو شوکت کیفی نے ایک با اخلاق خاتون کی طرح باورچی خانہ کی ذمہ داری سنبھالی اور ایسے ایسے لزیز پکوان کامریڈ تناول فرمانے لگے کے شوکت کیفی کی تعریفوں کے نعرے بلند ہونے لگے۔ شوکت کیفی تمام کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ کیفی اپنے حالات کے تحت کمیون میں رہ رہے تھے۔ جہاں پر کھانے وغیرہ کے تیس روپے ادا کرنے پڑتے۔ کیفی کی کل آمدنی ہی پینتالس روپے تھی۔ جس میں سے کھانے کے تیس روپے نکال کر باقی ماندہ پندرہ روپے ریلوے کے پاس اور سگریٹ کی نذر ہو جاتے۔ وہ اپنی بیگم کو کوئی پیسہ دے نہیں پاتے تھے۔ کیوں کہ کمیون میں رہنے کو باوجود پارٹی کی تنخواہ کیفی کے علاوہ ان کی بیگم کو نہیں مل سکتی تھی۔ آخر خدا نے خود انتظام کیا۔ کیفی نے ایک روز نامچہ اخبار ڈیلی نیوز پیپر Daily news paper میں پانچ روپے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنا شروع کی۔ کیفی کے حالات کو معقول بنانے کی فکر کیفی کو دن رات

ترکیب میں لگائے رہتی۔ اپنے شوہر کے حالات شوکت کیفی پر گراں گزرنے لگے۔ حالات کے پیش نظر شوکت کیفی کو کام کرنے کی ترغیب دینے والا واقعہ خود شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

”ایک دن پی۔ سی۔ جوشی میرے کمرے میں آ گئے۔ میں گھبرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیار سے کہا ”بیٹھو، بیٹھو“ اور خود ایک اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئے۔ پوچھا ”آج کل کیا کرتی ہو؟“ میں نے کہا کچھ نہیں“ پھر مسکرا کر بولے، ”تمہیں پتہ ہے کہ ایک اچھی بیوی بننے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ”ایک اچھی بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کا ہاتھ بٹائے، نوکری کرے، اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرے، اور پھر شوہر کے ساتھ پارٹی کا کام بھی کرے“۔ کافی دیر تک میرے بارے میں پوچھتے رہے۔ اور وہ جب اٹھ کر گئے تو میں نے اپنے اندر ایک عجیب وغریب طاقت کی اور میں نے فیصلہ کر لیا۔

اس زمانے میں کیفی نے مجھے ایک کتاب لا کر دی۔ ”انسان کا ارتقاء“۔ اسے پڑھ کر جو رہے سہے جالے میرے ذہن

میں لگے رہ گئے تھے وہ سب چھوٹ گئے۔

پھر میں نے اپنا ارادہ کیفی پر ظاہر کر دیا۔ کیفی چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ مزدوروں میں کام کروں۔ لیکن میں نے ''انڈین پیوپلز تھیٹر'' کا اسٹیج اپنے لیے چن لیا اور آج تک اس میں کام کر رہی ہوں۔ آج کل تو کیفی ''اپٹا'' کے پریسیڈنٹ ہیں۔

میں کمانے کے لیے ریڈیو ڈرامے میں بھی حصہ لینے لگی۔ کبھی فلم کی ڈبنگ مل جاتی۔ پارٹی نے کیفی کی دقت کو محسوس کیا اور ''نیا ادب'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے دو سو روپے ماہوار وتج مقرر ہوئی۔'' ۱۲

اگر ہم ''نظم'' مکان کی رونمائی کی بات کریں تو یہ ان دنوں کی بات ہے جب شوکت کیفی اور کیفی اعظمی پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کرنے کی غرض سے مدن پورہ کے مزدور علاقے میں جاتے۔ یہاں مقرر کے طور پر کبھی سردار جعفری تو کبھی سجاد ظہیر ہوتے۔ کیفی بھی ان مزدوروں سے مخاطب ہوتے۔ وہیں کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کیفی نے نظم ''مکان'' کہی جو اس طرح ہے:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کی خبر ہے نہ مکینوں کی خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور ذرا اور سنوارے ہم نے

آندھیاں توڑ دیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیے اس لیے بجلی کے ستارے ہم نے
بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورش تعمیر لیے

اپنی نس نس میں لیے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے
دن نکلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
راک آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھو، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

(مکان)

حالات کبھی کیفی اور شوکت کیفی کے خوشگوار ہوتے تو کبھی پریشانیوں کی موج انہیں جدوجہد پر ڈال دیتی۔ شوکت کیفی اپنے شوہر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کہیں کوشش کرتیں تو کبھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش ہو جاتیں۔ مہینے میں ایک بار ایک روپیہ کرائے کی وکٹوریہ میں بیٹھ کر چاندنی رات میں کمیون آنا شوکت کیفی کو دنیا جہان کی خوشی دیتا۔ شوکت کیفی نے اپنے شوہر کا کسی بھی حالات میں ساتھ نہیں چھوڑا۔ خواہ وہ امور خانہ داری ہو یا جلوس اور منگوں میں شریک ہو کر میلوں چلنا۔

کیفی کی ہر نظم اپنے ماحول اور معنی کے اعتبار سے اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کئی نظموں کے وجود میں آنے کو پیچھے ہندوستان کے حالات اور کیفی کا درد شامل ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی جب ۱۹۶۲ء میں تقسیم ہوئی تو کیفی کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ اور ان کی قلم سے جو نظم وجود میں آئی وہ ''آوارہ سجدے'' کے عنوان پر مبنی ہوئی۔

اک یہی سوزِ نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں

SMT. HANSA MEHTA LIBRARY
The M. S. University of Baroda

کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں
تم بھی محبوب مرے، تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی، چارہ گری
محرم درد جگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جائے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں
دور منزل تھی، مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لے کے پھری رہی رستے ہی میں وحشت مجھکو
ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آ جاتی
دار تک لے کے گیا شوقِ شہادت مجھ کو
راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں

ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا
کوئی نہیں

(آوارہ سجدے)

کیفی اپنے گاؤں اور گاؤں کی زندگی سے کافی دور ہو چکے تھے کہیں ۱۹۴۹ء میں اپنے بچے کی پیدائش کے سلسلے میں لکھنو اور پھر گاؤں جانا نصیب ہوا۔ کیفی اور شوکت کیفی تقریباً چار ماہ تک گاؤں مجواں میں رہے۔ جہاں پر رہنے پر کیفی سکون محسوس کر رہے تھے وہیں اپنی کیفیت کو شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

''اتنے دن گاؤں میں رہنے سے گاؤں سے میرا دل بھر گیا۔ میں گاؤں میں رہنے کی بالکل عادی نہیں ہوں۔ میرا بچپن حیدرآباد شہر میں گزرا۔ البتہ کیفی اپنے گاؤں میں بہت خوش تھے۔ وہیں سے تلنگانہ تحریک پر ''تلنگانہ'' نظم لکھ کر پارٹی کو بھیجی۔ کئی نظمیں انہوں نے گاؤں میں بیٹھ کر لکھی۔ گرمی سخت پڑتی تھی۔ ہمارے اندر کے کمرے میں چھت پر لگا ہوا ایک پنکھا ہوتا تھا، کپڑے کا، میں اور بچہ سوتے رہتے

اور یہ اپنی میز کے قریب اپنے پیر سے پنکھے کی ڈوری باندھ لیتے اور اسے کھینچرے رہتے اور ہاتھ سے نظمیں لکھتے اور سوچتے رہتے۔ کسی نے گاؤں کے لڑکوں سے یہ بات کہہ دی۔ اب کیا تھا لڑکے ہاتھ سے پنکھا کھینچنے کی نقل اتارتے۔ اور کیفی کو چھیڑتے۔ (گاؤں میں بیوی کا کام کرنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا)

پھر میں کیفی کے پیچھے پڑ گئی کہ یہاں سے چلو۔ پیسہ ہمارے پاس ایک نہیں، "چلیں تو کیسے" کیفی کہتے۔ پھر ہم کیفی کی چھوٹی بہت بشریٰ سے دوسو روپے لے کر بمبئی آ گئے۔" ۱۳

کیفی اور شوکت کیفی جب بمبئی پہنچے تو ان پر ایک اور پہاڑ ٹوٹا۔ ان کا اندھیر پر موجود کمیون ٹوٹ چکا تھا۔ انہیں سنبھالنے والے اور کنبے جیسی شفقت دینے والے اراکین بھی بکھر چکے تھے۔ بیگم رضیہ لکھنو بھیج دی گئیں تو سجاد ظہیر پاکستان۔ شوکت کیفی اس وقت اپنے بچے کو لے کر حیدرآباد مقیم پزیر ہوئیں۔ کیفی کے سر سے اب کچھ دنوں کے لیے بیوی اور بچوں کی ذمہ داری دور ہو چکی تھی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ کانفرنس کی جگہ

ممبئی کے بجائے بھیمنڈی پسند کی گئی کیوں کہ ممبئی میں اس کانفرنس کو کرنے پر پابندی عائد تھی۔

کیفی صاحب زندگی کی جد و جہد سے ممبئی میں گرفتار تھے کہ لکھنو سے آنے والے ایک تار نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ لکھنو میں بیوی بچے کو چھوڑ کر مطمئن کیفی کو کیا معلوم تھا کہ حالات اور سرمایہ کی تنگی کی ان کے بچے کو نگل لے گئی۔ کیفی صاحب کو لکھنو میں ٹائفائڈ اور نمونیہ ہوا اور پندرہ دن کی علالت کے بعد وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا اور جاتے جاتے کیفی اور شوکت کیفی کی دنیا کو تاریک کر گیا۔ کیفی اپنی بیگم کو لکھنو سے ممبئی لے آئے اور سلطانہ بیگم کے گھر چھوڑ دیا۔ اور دوبارہ کانفرنس کو کامیاب بنانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ کیفی کی محنت رنگ لائی۔ اور کیفی اور مہندر نتھ کی کوششوں سے کانفرنس کامیابن ہوئی۔ کیفی تو کانفرنس اور پارٹی کے کاموں میں اپنا غم بانٹ لیتے لیکن شوکت کیفی اپنے غم کو یوں بیان کرتی ہیں:

''بمبئی میں سلطانہ آپا کے گھر رہنے لگی۔ کیفی اور مہندر ناتھ کی انتھک کوششوں سے کانفرنس کامیاب ہوئی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا نیا

مینی فیسٹو وجود میں آیا۔ کانفرنس کی مصروفیات میں تھوڑے دن تو گزر گئے لیکن بچہ کے یاد مرے دل سے نہیں جاتی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی ۔ اس کا ایک چھوٹا سے کرتہ اپنے پاس رکھتی۔ اسے آنکھوں پر رکھ لیتی بس اسٹاپ پر اگر کسی عورت کی گود میں ایک سال کا بچہ دیکھ لیتی تو اپنا بچہ یاد آ جاتا اور پیروں میں اتنی سکت نہ رہتی کہ کھڑے رہ سکوں۔" ۱۴

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ کیفی صاحب نے گانے لکھنے کی ابتدا کب اور کیوں کی تو اس کے لیے شبانہ جو کیفی صاحب کی دوسرے نمبر کی اولاد ہے اس کی ولادت اسراس کے بعد کی کیفی کی فکر ذمہ دار ہے۔

کیفی پارٹی کے کام میں شامل تھے۔ چنانچہ حالات کے پیش نظر انہیں لوگوں کی نگاہوں سے چھپنا یعنی انڈر گراونڈ ہونا پڑتا۔ ایسے حالات امیں شوکت کیفی کی ذمہ داری پارٹی پر آ جاتی اور چونکہ شوکت کیفی تنہا تھیں تو کسی پر گراں نہ گزرا لیکن جیسے ہی کسی بچے کی موجودگی کی بو پارٹی تک پہنچی سخت مخالفت کی گئی کہ بچہ نہیں ہونا

چاہئے۔ شوکت کیفی اپنے پہلے بچے کی وفات سے ابھرنے کے لیے ابھی دوسرے بچے کے آنے کی امید لگائے بیٹھی تھیں وہاں یہ مخالفت نے انہیں بھی مخالفت پر آمادہ کر دیا اور شوکت کیفی اپنی والدہ کے گھر چلی گئیں اور وہیں ''شبانا'' کی پیدائش ہوئی۔

کیفی رات دن اس کوشش میں لگے رہے کہ کس طرح پارٹی اور سماج کے پچھڑے طبقے کو بعداری تک لے جایا جائے۔ بمبئی کے ناگپاڑہ نامی مضافاتی علاقہ میں پارٹی نے ریجنل کمیٹی قائم کی۔ کیفی سکریڑی کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ کیفی نے اپنے قول اور فعل کے ذریعے مزدوروں کو منظّم کرنے کا کام شروع کیا اور مزدوروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے طوائفوں اور چکلوں کے یہ بہترین کام کیے۔ کئی مظلوم اور بے بس خواتین کی مدد کی۔ کیفی کو اپنے ان کاموں کی وجہ سے کئی بار شوکت کیفی سے دور رہنا پڑا، یعنی وشیدہ۔ یفی کے وقتاً فوقتاً نڈر گرائنڈ ہونے کا ایک واقعہ شوکت کیفی یوں فرماتی ہیں:

''مجھے ماد ہے کہ جب کوئی کامریڈ چھپتے چھپاتے مجھے ان سے ملانے لے جاتا تو خوشی سے میرا دل دھڑکنے لگتاا۔ کبھی کبھی

مہینوں کے بعد ملنا ہوتا۔ ایک ماہ بعد اندھیری کے کسی گھر میں جب میں ان سے ملنے گئی تو میں نے انہیں پہچانا ہی نہیں۔ انہوں نے مونچھیں رکھ لی تھیں۔ میں نے دیکھتے کہا۔ ''ہتوبہ یہ کیا شکل بنالی ہے، بالکل پولس کانسٹبل لگتے ہو''۔ کیفی ہنس کر کہنے لگے ''اسی لیے تو جیل جانے سے بچا ہوا ہوں۔'' ۱۴

کیفی کو اپنی غربت اور مفلسی اور اپنے بچے کیی ہپرورش کی فکر نے فلمی گانے لکھنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے شاہد لطیف کی فلم ''بزدل کے لیے'' روتے روتے گزر گئی رات رے'' اور ''کاہے اب رے بلم'' یوں دو فلمی گانے قلم طراز کیے۔ دونوں گانوں کا معاوضہ ایک ہزار روپے دیا۔

جب کیفی کی بیٹی شبانا دو مہینے کی تھی اس وقت شوکت اور کیفی ڈم ٹمکر روڈ پر رہائش پذیر ہوئے۔ یہاں شوکت کی ملاقات زہرہ نامی خاتون جو پرتھوی تھیٹر میں اور اپٹ کے ڈراموں میں سرگرم عمل تھیں ملاقات ہوئی۔ شوکت کے کام کرنے کے ارادے کو شوکت

نے ان پر طاہر کیا پھر کیا تھا۔ زہرہ آپا نے انہیں پرتھوی راج سے ملاقات کروائی جنہیں لوگ پاپا جی کہتے تھے۔ شوکت کیفی سو (۱۰۰) روپے ماہانہ کی تنخواہ پر کام کرنے لگیں۔ شبانا شوکت کیفی کے ہمراہ رہتی جس پر تھیٹر کے کسی بھی فرد کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ آج شبانہ ایک کامیاب فلم اداکارہ ہیں۔ اس کی بنیاد میں شاید شوکت کیفی کی اس وقت کی جدوجہد میں شبانہ کو شامل رکھنا ذمہ دار ہے۔ شبانہ تقریباً تین سال کی عمر تک تھیٹر میں اپنی والدہ کے کام میں ان کے ساتھ رہیں۔

کیفی کی تمنا اور سلطانہ بیگم کی کوششوں سے شبانہ کو ایک بہترین اسکوم میں داخلہ مل گیا۔ سبانہ پڑھنے میں کافی ذہین اور ملنسار طبیعت کی بچی تھیں۔ شبانہ ہر سال اسکول میں اول درجہ پاتیں۔ شوکت کیفی کو اپنی بچی پر ناز تھا۔

کیفی نے فلمی گانوں کو نئی سمت دی اور ان کے تحریر کردہ گانے کافی مقبول ہوتے۔ مثلاً کاغذ کے پھول فلم کا گانا:

وقت نے کیا کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم

بیقرار دل اس طرح ملے
جسطرح کبھی ہم جدا نہ تھے
تم بھی کھو گئے ہم بھی کھو گئے
ایک راہ پر چل کے دو قدم

وقت نے کیا۔۔۔۔۔

جائیں گے کہاں، سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں
کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں
بنر ہے ہیں دل خواد دم بہ دم

وقت نے کیا۔۔۔۔۔

(کاغذ کے پھول)

اسی طرح کیفی نے بے شمار فلمیگانوں سے سب کا دل

جیت لیا۔ کیفی کے قلم کا کمال لوگوں پر ان کے دو کارناموں سے خود بخود ظاہر ہو گیا۔ ایک تو ''گرم ہوا'' فلم جس کی کہانی، ڈائلاگ اور اسکرین پلے خود کیفی نے ہی لکھے اور دوسرا چیتن صاحب کی فلم ''ہیر رانجھا'' جو پوری منظوم فلم ہے۔ فلم گرم ہوا کے لیے کیفی کو تین ایوارڈ ایک ساتھ ملے، کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کا اور کہانی کیلئے نیشنل ایوارڈ۔

کیفی کی زندگی میں شوکت کیفی ان سے ہر دور اور ہر قوت جڑی رہیں۔ کیفی کی بیماری سے متعلق ایک حادثہ شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

''۹ فروری ۱۹۷۳ء کو فالج کا اس قدر زبردست حملہ ہوا کہ زندہ رہنے کی کوئی آس نہ رہ گئی تھی۔ (بلڈ پریشر ان کو اکثر رہتا تھا۔ ایک دن ان کو چکر آیا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے۔ پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ تھوڑے دن بعد اسی طرح بے ہوش ہوئے۔ ڈاکٹروں نے زیادہ تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ ایک رات بخار اور شدید درد کی شکایت ہوئی اور اسی دوران ڈھر سے ان کا ہاتھ بے جان ہو کر گر پڑا ان کو شبہ بھی نہیں تھا کہ یہ ان کا ہاتھ ہے۔ اسپتال میں کافی دن زیر

علاج رہے مگر انہیں لیٹے رہنے کی وجہ سے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ مفلوج ہو چکے ہیں)۔ بارہ گھنٹے برین ہیمرج میں رہ کر کوئی واپس نہیں لوٹ سکتا۔ اور کیفی لوٹ آئے میرے لیے، میرے بچے کے لیے۔ میں ان کی کافی شکر گزار ہوں اور ساتھ ہی خدا کی بھی جس نے مجھ پر رحم کیا۔‘‘ ۱۵

کیفی جتنے بھی دن اسپتال میں رہے شوکت کیفی ان کا سایہ بنی رہیں۔ یہاں بھی کیفی کو کہاں چین تھا۔ ہر روز نئے کمالات ظاہر کرنے سے کیفی باز نہ رہے۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ شوکت کیفی یوں بیان فرماتی ہیں:

’’ایک دن سلطانہ آپا کے گھر پہنچیں جہاں کیفی بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ ان کے دروازے پر Don't disturb کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ بیوی بھی چار بجے سے پہلے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک طالب علم کیفی کے سرہانے بیٹھا اپنا دکھڑا سنا رہا ہے۔ اور کیفی نیم بے ہوشی میں اپنے سر کے درد کے باوجود بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ میں یہ دیکھتے ہی

جھنجھلا گئی۔ ''حد ہو گئی ڈاکٹر نے آپ کو بات کرنے سے منع کیا ہے اور آپ اس سے باتیں کر رہے ہیں''۔ پھر میں نے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا ''میاں تم ذرا باہر آؤ''۔ وہ کسمسانے لگا۔ ''میں۔۔۔ میں کیفی صاحب کو اپنے حالات سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے پیار سے کہا ''ذرا آپ باہر آ جائیے مجھے وُپ سے کچھ کہنا ہے''۔ لڑکا اٹھ کر باہر آنے لگا تو کیفی نے اپنی نحیف لڑکھڑاتی آواز میں کہا: ''موتی یہ اسٹوڈنٹ ہے اسے کچھ مت کہنا ہو سکے تو اس کی جو ضرورت ہے اسے پوری کر دینا۔ میں اچھا اچھا کہہ کر باہر نکل گئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ احمد آباد کا رہنے والا ہے۔ سوتیلی ماں سے گھبرا کر بھاگ آیا ہے اور یہاں کام چاہتا ہے۔ اور کیفی سے کام مانگنے آیا ہے۔''[۱۶]

ہاسپٹل میں رہتے ہوئے کیفی کا ایک اور کارنامہ تھا ''نظم دھماکہ''۔ کیفی کی یہ نظم کا تحریری کام شمع زیدی نے سرانجم دیا۔ کیفی اپنی لڑکھڑاتی زبان میں کہتے جاتے اور شمع تحریر کرتی جاتیں۔

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے   افق پر برق

سی لہرا رہی ہے

قیامت ہر طرف منڈلا رہی ہے   زمیں
ہچکولے پیہم کھا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
مچلتی، جھومتی، ہلچل مچاتی   تڑپتی، شور
کرتی، دل ہلاتی
گرجتی، چیختی، فتنے اٹھاتی   قیامت کو جگا
کر لا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
فضا میں آتشیں پرچم اڑاتی   زمیں پر
آگ کے دھارے گراتی
شرارے رولتی شعلے بچھاتی   سنہری روشنی
پھیلا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
فضا گل جنگ کا میداں بنی ہے   ہوا بپھرا ہو
طوفاں بنی ہے
زمیں گہوارۂ جناں بنی ہے   فلک سے خاک سر

ٹکرا رہی ہے

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

بڑھی آتی ہے تعمیری تباہی جکھی پڑتی ہے نور

افزا سیاہی

جھکولے کھا رہا ہے قصر شاہی ہوا زنجیر در کھڑ کا

رہی ہے

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

بٹا رکھے ہیں پہرے بیکسی نے خزانوں کے پھٹے

جاتے ہیں سینے

زمیں دہلی، ابھر آئے دفینے دفینوں کو ہوا ٹھکرا

رہی ہے

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

نشانات ستم پھرا رہے ہیں حکومت کے علم ٹھرا

رہے ہیں

غلافی کے قدم تھرا رہے ہیں غلامی اب وطن سے

جا رہی ہے

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

(آندھی)

اسی طرح نظم ''زندگی'' جس کی ابتدا تو بریچ کینڈی ہاسپٹل میں ہوئی لیکن یہ نظم اپنے انجام تک روس میں پہنچی جہاں ۱۹۷۴ء میں علاج کے لیے کیفی کو لے جایا گیا۔

آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی، بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ سحر ماتھے پہ شبنم چھڑکے
اس سے پہلے کہ مری بیٹی کو وہ پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ مرے بیٹے کا مضبوط بدن
تن مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ

میرے ہونٹو کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی

زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کے لیے کیا کیا نہ کیا
کبھی آسانی سے اک سانس بھی یم راج کو اپنا نہ دیا
آج سے پہلے بہت پہلے
اسی آنگن میں
دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا، مرے تلووں سے دھواں اٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف
کچے احساس پہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
میں پگھل جاؤں گا
اور پگھل کر مرا کمزور سا ’’میں‘‘

قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا
رو رہا تھا مگر اشکوں کے بغیر
چیختا تھا مگر آواز نہ تھی
موت لہراتی تھی سو شکلوں میں
میں نے ہر شکل کو گھبرا کے خدا مان لیا
کاٹ کے رکھ دیئے صندل کے پراسرار درخت
اور پتھر سے نکالا شعلہ
اور روشن کیا اپنے سے بڑا ایک الاؤ
جانور ذبح کیے اتنے کہ خون کی لہریں
پاؤں سے اٹھ کے کمر تک آئیں
اور کمر سے مرے سر تک آئیں
سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خون دینے لگے
میرے اعضا کی تھکن

بن گئی کانپتے ہونٹو پہ بھجن
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح

”اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری کندے
جو تری بھینٹ کو لیا آیا ہوں
ان کو سوئیکار کر اور ایسے دھدھ
کہ مچلتے شعلے کھینچ لیں جوش میں
سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جو امر کر دے مجھے
ایسا کوئی راگ ملے“

اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکاں نے لی انگڑائی

اور کانوں میں کہیں دور سے آواز آئی
بدھم شرنم گچھامی
ھمم شرنم گچھامی
سنگھم شرنم گچھامی
چار ابرو کا صفایا کر کے
بے سلے دستر سے ڈھانپا ہبدن

پونچھ کے پتنی کے ماتھے سے دمکتی بندیا
سوتے بچے کو بنا پیار کیئے
چل پڑا ہاتھ میں کشکول لیے
چاہتا تھا کہیں بھکشا ہی میں جیون مل جائے
جو کبھی بند نہ ہو دل کو وہ دھڑکن مل جائے
مجھ کو بھکشا میں مگر زہر ملا
ہونٹ تھرانے لگے جیسے کرے کوئی گلہ
جھک کے سولی سے اسی وقت کسی ے یہ کہا
تیرے اک گال پہ جس پل کوئی تھپڑ مارے

دوسرا گال بھی آگے کردے
تیری دنیا میں بہت ہنستا ہے
اس کے سینے میں اہنسا بھردے
کہ یہ جینے کاس طریقہ بھی ہے انداز بھی ہے
تیری آواز بھی ہے، میری آواز بھی ہے
میں اٹھا جس کو اہنسا کو سبق سکھلانے
مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے
آ رہا تھا میں کئی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھ کو

کسی مینار سے نیچے آ کر
اللہ کبر، اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گماں
کہ یہ ہپر جوش اذاں
موت سے دے گی اماں
پھر تو پہنچا میں جہاں

میں نے دوہرائی کچھ ایسے یہ اذاں
گونج اٹھا سرا جہاں
اللہ اکبر، اللہ اکبر
اسی آواز میں اک اور بھی گونجا اعلان
کل من علیھا فان
اک طارف ڈھل گیا خورشید جہاں تب کا سر
ہوا فالج کا اثر
پھٹ گئی نس کوئی شریانوں میں خوں جم سا گیا
ہو گیا زخمی دماغ
ایسا لگتا تھا کہ بجھ جائے گا جلتا ہے جو صدیوں سے چراغ
آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
یہ سمندر جو بڑی دیر سے طوفانی تھا

ایسا تڑپا کہ مرے کمرے کے اندر آیا
آتے آتے وہ مرے واسطے امرت لایا
اور لہرا کے کہا

شیو نے یہ بھجوایا ہے لو پیو اور
آج شیو علم ہے، امرت ہے عمل
اب وہ آساں ہے جو دشوار تھا کل
رات جو موت کا پیغام لیا اے آئی تھی
بیوی بچوں نے مرے
اس کو کھڑکی سے پرے پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا اک جام لیے آئی تھی
اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کے لیے
رات کی لاش ملی پانی میں۔

(زندگی)

کیفی کی اب تک چار کتابیں چھپ چکی ہیں۔ جھنکار، آخر شب، آوارہ سجدے اور فلمی گیتوں کا مجموعہ میری آواز سنو۔ آوارہ سجدے ان کا نیا انتخاب ہے۔ آخر شب کے بعد انہوں نے بہت ساری نظمیں لکھیں لیکن اسے اس مجموعۂ کلام میں شامل کرنے

کے قابل نہیں سمجھا۔ اس مجموعے کو کافی انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ جیسے نہرو ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایورڈ اور یو۔ پی۔ اردو اکادمی ایوارڈ وغیرہ وغیرہ۔

کیفی کو صرف انسان سے ہی نہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں سے بھی حد درجہ محبت اور اپنائیت تھی۔ انہیں مختلف پودے لگانا پسند تھا۔ وہ دور دور سے پودے منگوا کر اسے لگاتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے باغیچہ میں پودے کے بیج لگانے میں مصروف تھے کہ ایک مرغی اور اس کے بچوں نے کرید کرید کر بیج نکال لیا۔ کیفی صاحب نے بے ارادہ سے ایک پتھر مرغیوں کی جانب انہیں بھگانے کے مقصد سے اچھال دیا جس کی وجہ سے مرغی کا ایک بچہ ہلاک ہو گیا۔ کیفی کی بہت کوششوں کے باوجود وہ بچہ نہ بچ سکا۔ اس حادثے نے کیفی کو دکھی کر دیا۔ ایک معمولی سے مرغی کے بچے کے ہلاک ہونے پر جس شخص کو اس قدر دکھ ہو کہ وہ تحریری کام بھی نہ کر سکتے تھے۔ ایسے شخص کے دل میں انسان اور انسانیت کی فکر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

کیفی چاہے جتنے ہی بیمار رہتے علالت کے باوجود انہوں نے کبھی بھی اپنے ایک ہاتھ کے مفلوج ہونے کے باوجود

اسے اپنے راستہ کا پتھر ہ سمجھا۔ کیفی کی اسی قوت ارادی کو شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:

> "ایک مرتبہ بہار کے ایک شہر گیا میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس تھی۔ ان لوگوں نے کانفرنس انتہائی گرمی کے مہینے میں رکھ دی۔ کیفی نے فیصلہ کرلیا کہ میں جاؤں گا۔ میں بے حد ڈر گئی۔ اچھے اچھے رائٹرس گیا کی گرمی سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن کیفی کی ضد ان کو گیا لے گئی۔ وہاں سے وہ ہپٹنہ پیس کانفرنس میں بھی گئے۔ وہاں تو ہم دونوں مرتے مرتے بچے۔ اسٹیشن پر ایک لاکھ کسان واپس جارہے تھے۔ اس میں میں اور کیفی پھنس گئے۔ اگر اس وقت ایک کسان اپنا ڈنڈا گھما کر ہماری مدد نہ کرتا تو لوگ ہم دونوں کو کچل کر آگے بڑھ جاتے۔" ۱۷

کیفی کی زیادہ تر نظمیں کسی نہ کسی حالات سے دوچار رہی ہیں۔ اسی ہی ایک نظم "لکھنو تو نہیں" انہوں نے لکھنو کے ایک ہاسپٹل میں بیماری کی حالت میں قلم بند کی جس کا بیان ضروری ہے۔

لکھنو کے اسپتال تک پہنچے کے لیان

کیاپنیگاؤں اور پیڑ پودے سے محبت ذمہ دار ہے۔ گاؤں کیسرخ بنوانے کے سلسلے میں چیف منیسٹر یو۔ پی۔ رم نریش یادو سے ملنیگئے۔ کیفی سیڑھیا چڑھ رہے تھے کہ پیر پھسل گیا اور وہ گر پڑے۔ ان کے بائیں پیر کے چڑھے کی ہڈی کے ٹکڑے ہو گئے۔ کیفی کو لکھنو کے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ران میں تین گکہ سے ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اور پیٹ میں ہمرتج ہو گیا ہے۔ آنتوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ دھیمے دھیمے افاقہ ہوا اور آپریشن کے بغیر ران کی ہڈی بھی جوڑ دی گئی۔ کیفی ساڑھے چار مہینے بید پر چت لیٹے رہے۔ اتنے غیر معمولی حالات اور جسم میں اتنی تکلیف کے باوجود کیفی ہمیشہ خوش رہتے اور ہر دن کے مکمل ہونے پر خدا کا شکر بجالاتے۔ یہاں پر تخلیق پائی نظم ''لکھنو تو نہیں'' قومی آواز میں چھپی۔

کیفی نے کبھی کسی پر بوجھ بننے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنی ضروریات کی اشیاء اپنی محنت سے حاصل کرتے۔ ان کی خودداری کا ایک واقعہ شوکت کیفی یوں بیان کرتی ہیں:۔

‘‘اگر انہیں کچھ خریدنا ہوتا تو پہلے کوشش کرتے کہ کوئی کام مل جائے اور پیسے مل جائیں تو وہ کام کریں۔ کبھی کبھی شبانہ چڑھ کر کہتی ‘‘ابا اگر یہی پیسے بابا (میرا بیٹا شبانہ سے چھوٹا ہے) کماتا تو آپ ہرگز اتنا پرہیز نہ کرتے۔’’ تو ہنس کر جواب دیتے۔ ‘‘نہیں بیٹے انسان کو اس وقت تک اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہیے جبتک اس کی طاقت ستھ نہ دے۔’’ ۱۸

اپنے گھریلو ماحول کو محسوس کرتے اور اس پر غور بھی کرتے جب صبح کیفی اپنی فیمیلیکے ستھ لان میں بیٹھ کر چاے پیتے اس وقت وہ اپنی اہلیہ شوکت کیفی ے عمل پر نظر ثانی کرتے۔ ایسے ہی ماحول کو انہوں نے اپنی نظم ‘‘ایک لمحۃ’’ میں یوں بیان کیا ہے۔

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی اک لمحہ

جس میں دو بولتی آنکھیں
جائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کے دل میں کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یوں ہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لیے
غم کی سوغات لیے
گرمئ جذبات لیے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں
برف پگھلنے ہی لگے

(ایک لمحہ)

انٹرنیٹ پر کیفی صاحب کے شعر پڑھنے کے طریقے کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ کیفی روایتی انداز میں ترنم کے

ساتھ شر پڑھنے نظر آتے ہیں۔ کیفی کے شعر پڑھنے کے طریقے کو علیسر دار جعفری یوں بیان کرتے ہیں:

”کیفی کے زور دار اور مہذب پڑھنے کے انداز نے ان کی شاعری کو ایک خاص معنی عطا کیے۔ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ بھی دوسرے شاعروں کے مانند مشاعروں میں روایت کی طرح اپنے شعر ترنم کے س ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ایک دفعہ جب انہوں نے اپنی ایک نظم مسر
سروجنی نائڈو کو سنائی تو انہوں نے آخر میں مسکرا کر پوچھا کہ تمہیں اپنی آواز کا کچھ اندازہ ہے۔ تم نے کبھی سنا ہے؟ اور پھر انہوں نے کیفی سے اپنی شاعری تحت االفظ پڑھنے کے لیے کہا۔ جس پر کیفی راضی ہو گیے۔ اور اسی کے بعد ہمیشہ کے لیے کیفی اور ان کی شاعری کی سیرت ہی بدل گئی۔“ ۱۹

حامد اللہ ندوی اکے تحت الفظ پڑھنے کے انداز کا
بیان اس طرح کرتے ہیں:

''کیفی اپنا کلام ہمیشہ پانی اونچی اور بھاری آواز میں ایک مجاہد کی طرح پورے جوش وخروش کے ساتھ سنانے کے عادی تھے اور سناتے وقت اپنے اشعار کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے اس خوبصورتی کے ساتھ ان کو مصور کر دیتے تھے کہ سامعین پر بھی ایکجوش کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔'' ۲۰

کیفی کو ہمیشہ اپنے لوگ اور قوم وملت کی فکر رہی۔ انہوں نے کبھی کسی بھی وقت کی شکایت نہیں کی۔ ان کے مضبوط جسم میں لوگوں کے لیے تڑپنے والا دل موجود تھا۔ وہ دوستوں سے وفادار تھے۔ انہوں نے ہمیشہا خلاق کے دامن کو پکڑ ریکا۔ سخت سیسخت حالات میں بھی وہ خدا کا شکر بجا لاتے رہے۔ بڑی سے بڑی بیماری میں بھی انہوں نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنے جسم پر بڑی سے بڑی آفت اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ وہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور اس کی مدد کرتے اور ہمیشہ دوسروں کو مدد کرنے کی تلقین کرتے۔ کیفی کو شعر و شاعری کے علاوہ کتابیں

خریدنے اور پودے لگانے کا شوق تھا۔ وہ کئی دور دور سے پودے منگوا کر باغ میں لگاتے۔

کیفی کھانے کے معاملے میں سادگی پسند رہے۔ قیمتی اور لذیز غذا کی جانب ان کا لگاؤ کم تھا۔ دال چاول اور روٹی پر بھی وہ بے شکایت گزار لیتے تھے۔

کیفی بہت زیادہ گفتگو پسند نہیں تھے۔ وہ مزید خاموش رہتے۔ کیفیسے متعلق عزیز قریشی فرماتے ہیں:

> ''کیفی کم آمیز ہیں لیکن ان کے دوست بے شمار ہیں۔ کیفی کم گو ہیں لیکن ان کے اطراف ان کے سمجھنے اور ان کو چاہنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ کیفی تنہائی پسند ہیں لیکن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے لے کر کمیونسٹ پارٹی اور پھر اپٹا کے ہر ہنگامے اور ہر سرگرمی میں کیفی صاحب سرگرم رہتے ہیں۔ کیفی کم ہنستے ہیں لیکن پتہ نہیں انہیں کیوں مل کر خوش وقتی کا احساس ہوتا ہے۔ کیفی کھلتے نہیں لیکن ان کے چاہنے والے برسوں سے ان کے چاہنے والے ہیں۔''۲۱

اس طرح کیفی اعظمی نے اپنی پوری حیات میں زندگی کے ہر ہحالات کا بڑی ہمت اور صبر سے سامنا کیا۔ انہوں نے کبھی بھی شکایت اور دہائی کا سہارا نہیں لیا۔ آج کیفی صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کے کارنامے قوم کے لوگوں کی جانب ان کی جدوجہد، عورتوں اور نوجوانوں میں بیداری کے کام اور ادب میں دیے گئے ان کے قیمتی عطیات کو عوام آج بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ کی وفات ۱۰ مئی، ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ اور ادب کی ایک ایسی شمع جس نے اپنی بے شمار نظموں، غزلوں، فلمی گیتوں اور بیداری کے پیغامات سے سماج کی آسلاح کی تھی وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ظاہری طور پر بجھ چکی تھی لیکن عوام اور قارئین کے دلوں میں آج بھی روشن ہے اور روشن رہے گی۔

حواشی:

حواشی:۔

۱ کیفی اعظمی: میں اور میری شاعری ص ۷
۲ ایضاً۔ ص ۱۹
۳ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۲۰
۴ عصری ادب: ۴۹، ۴۸ شوکت کیفی ص ۲۱
۵ کیفی اعظمی: فکروفن ڈاکٹر شکیلہ رافت علی ص ۲۴، ۲۳
۶ کیفیات۔ کیفی اعظمی ص ۱۰
۷ ایضاً۔ ص ۱۳، ۱۲، ۱۱
۸ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ۵۷
۹ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۸۰
۱۰ کیفیات۔ کیفی اعظمی ص ۱۵، ۱۴
۱۱ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۴۲، ۴۱
۱۲ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ص ۴۵
۱۳ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ص ۴۸
۱۴ ایضاً۔ ص ۴۹
۱۵ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی، کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔ شاہد ماہلی ص ۶۴، ۶۳
۱۶ کیفی اعظمی: میرے ہمسفر، شوکت کیفی ص ۵۳
۱۷ ایضاً۔ ص ۵۴
۱۸ کیفی اعظمی: فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۶۱
۱۹ ایضاً۔ ص ۶۴
۲۰ کیفی اعظمی: علی سردار جعفری ص ۱۰۲، ۱۰۱
۲۱ کیفی صاحب: چند جھلکیاں حامد اللہ ندوی ص ۲۳۴
۲۲ کیفی صاحب: دو نیم مسکراہٹ کا نام، عزیز قیسی ص ۲۱۶، ۲۱۵